"حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت"

ملک غلام علی صاحب

مولانا مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت کے خلاف اب تک جتنی بھی تحریریں یا کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ایک دو کے ماسوا خامہ فرسائی کے ڈانڈے ہرزہ سرائی اور دشنام طرازی سے جا ملے ہیں۔ اس لیے ترجمان کے صفحات میں ان سے براہِ راست کم ہی تعرّض کیا گیا ہے۔ اس ساری ہنگامہ آرائی کے بعد اب ماہنامہ "البلاغ" میں مدیر البلاغ مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کا ایک مضمون بالاقساط چھپنا شروع ہوا ہے۔ اس کی آمد ایک مدت سے سُنی جا رہی تھی، مگر مولانا محمد تقی صاحب کے بقول اُنہوں نے اِس مقالے کو منظرِ عام پر لانے کے لیے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا ہے جب کہ اِس موضوع پر بحث و مناظرہ کی گرماگرمی دھیمی پڑ رہی ہے اگرچہ یہ بات کہتے وقت صاحبِ موصوف کو یاد نہیں رہا کہ عین اسی زمانے میں ایک اور بحث گرماگرمی کی حدسے بھی تجاوز کر چکی ہے، یعنی اسلام اور سوشلزم کی بحث۔ اور انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اس موقع پر سوشلزم کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کرنے والوں کو مجروح کرنے کی کوشش کرنا کسی ایسے شخص کا کام نہیں ہو سکتا جس کے دل میں اسلام کا واقعی کوئی درد ہو۔ لیکن بہر حال اپنے لیے وقت کا انتخاب کرنا ان کا اپنا کام ہے۔ البتہ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ اُن کی تنقید کا انداز نسبتاً غنیمت اور اس لیے قابلِ اعتنا ہے۔ میں چونکہ ترجمان القرآن کے رسائل و مسائل میں اس موضوع سے متعلق چند سوالات کا جواب دے چکا ہوں اور بعض احباب نے مجھ سے اس مضمون پر بھی اظہارِ خیال کا تقاضا کیا ہے اس لیے مَیں اس کے بعض ضروری پہلوؤں پر اپنا تبصرہ پیش کر رہا ہوں۔

عثمانی صاحب نے اپنے مضمون کے ابتدائی پانچ صفحات تمہیدی کلمات کی نذر کیے ہیں۔ ان سب کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن چند باتیں بہر حال لائقِ توجہ اور محتاجِ تبصرہ ہیں۔

مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ چند سال تک وہ خلافت و ملوکیت کا مطالعہ کرنے سے بھی گریز کرتے رہے۔ لیکن بعد میں فتنہ آب و تاب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اس لیے خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلے کی حقیقت واضح کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا" کیا میں جناب محمد تقی صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ خلافت و ملوکیت کے لکھے جانے سے بہت پہلے ناصبیت اور یزیدیت کے حق میں جو منظم اور وسیع تحریری پروپگنڈا ہمارے ملک میں منظرِ عام پر آنا شروع ہو گیا تھا، کیا ان کی نظر میں وہ بھی فتنہ کی تعریف میں آسکتا تھا یا ان کے نزدیک فتنہ بس ایک ہی تھا جس سے نمٹنا بہرحال مقدم تھا؟ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ یہ حضرات مولانا مودودی کی خبر لینے میں تو بہت سرگرم و مستعد ہیں، لیکن اُس تحریک کے مقابلہ میں بالکل خاموش ہیں جس کے علمبردار علی الاعلان یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام میں سرے سے کوئی نظریۂ خلافت و سیاست دیا ہی نہیں، خلافت و ملوکیت میں کوئی فرق و امتیاز ہے ہی نہیں، جو شخص جس طرح چاہے حکومت حاصل کر لے اور جس طرح چاہے اسے چلائے، اسلام سب کو سندِ جواز عطا کرتا ہے۔ ابوبکرؓ کو ایک غیر نمائندہ اجتماع میں خلیفہ بنا دیا گیا تھا، علیؓ کی خلافت سرے سے منعقد ہی نہیں ہوئی تھی، وہ خلیفہ نہ تھے بلکہ طلبِ خلافت کے لیے لڑتے رہے، حسینؓ نے "امیر المؤمنین یزیدؒ کے خلاف خروج کیا" اور اپنے نانا کے فرمان کے مطابق انہیں قتل ہونا ہی چاہیے تھا۔ ان باتوں سے اسلام کے تصورِ خلافت کی جو مٹی پلید کی جا رہی تھی، اور نئی نسل کے ذہن کو اسلام کے سیاسی نظام کے متعلق جن الجھنوں میں مبتلا کیا جا رہا تھا اس کی اصلاح کی ضرورت کسی بزرگ نے محسوس نہ کی۔ کتاب "خلافت و ملوکیت" اس ضرورت کو پورا کر رہی تھی، لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ بعض حضرات اُس گمراہی کی روک تھام کرنے کے بجائے اپنا پورا زور اسی کتاب کی تردید و تغلیط پر صرف کر رہے ہیں اور اُس ناصبیت اور یزیدیت کے معاملہ میں بالکل خاموش ہیں جو ان کی آنکھوں کے سامنے برسوں سے پھیلائی جا رہی ہے۔ مولانا مودودی کی کتاب پڑھ کر جن اصحاب کو صحابہ و عدالتِ صحابہ کے دفاع کی فکر لاحق ہو جاتی ہے، عجیب بات ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت حسینؓ، اور بعض دوسرے صحابۂ کرام کے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کوئی بات ان کو عدالتِ صحابہؓ کے خلاف محسوس نہیں ہوتی۔

مدیر البلاغ نے دوسرے معترضین کی پیروی کرتے ہوئے سرے سے اس بات کو سمجھنے کی کوشش ہی

نہیں کی ہے کہ کتاب کا اصل موضوعِ بحث کیا ہے اور اس کو نظر انداز کر کے کتاب کی ایک ضمنی بحث کو موضوعِ تنقید بنا لیا ہے، حالانکہ اگر اس ضمنی بحث میں کوئی چیز غلط بھی ہو تو اُس کا کوئی اثر اُس مسئلے پر نہیں پڑتا جس پر خلافت و ملوکیت میں کلام کیا گیا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام میں خلافت کس چیز کا نام ہے؟ خلافت اور ملوکیت میں فرق کیا ہے؟ اسلام کا اصل نظامِ سیاست ان دونوں میں سے کون سا تھا؟ اصل نظام میں تغیر اور خلافت سے ملوکیت کی طرف انتقال کب اور کیسے ہوا اور اس انتقال سے جو دوسرا نظام (یعنی نظام بادشاہی) قائم ہوا اس میں اور نظامِ خلافت میں وجوہِ امتیاز کیا تھے؟ پھر اہلِ سنت نے اس دوسرے نظام کو اگر قبول کیا تو کس معنی میں کیا؟ آیا یہ قبولیت کسی مصلحت کی بنا پر تھی یا اس بنا پر کہ یہ دونوں نظام اہلِ سنت کے نزدیک یکساں صحیح اور مقبول اسلامی نظام تھے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جس سے ہر اُس شخص کو سابقہ پیش آتا ہے جو اسلامی تاریخ اور اسلامی نظامِ سیاست کا مطالعہ کرتا ہے۔ عربی مدارس کے ماحول میں اس سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے، لیکن اس ماحول سے باہر کی دنیا میں، جہاں اس وقت مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے متعلق علمی اور عملی حیثیت سے نہایت دُور رس نتائج رکھنے والے فیصلے ہو رہے ہیں، اس مسئلے کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ خلافت و ملوکیت میں ساری بحث اسی مسئلے پر کی گئی ہے۔

اب اگر کسی شخص کو اُن نتائج اور دلائل و شواہد سے اختلاف ہے جو اس کتاب کے مصنف نے پیش کیے ہیں، اور وہ فی الواقع اس مسئلے میں اسلام کی کوئی علمی خدمت انجام دینا چاہتا ہے، تو اسے چاہیے کہ صرف نفی پر اکتفا نہ کرے بلکہ خود یہ بتائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصریح اور علمائے اہلِ سنت کی متفقہ رائے کے مطابق خلافتِ راشدہ کا دور حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت پر کیوں ختم ہو گیا؟ اُس دور کے بعد آنے والے نظام کو خلافت کے بجائے ملوکیت کا نظام کیوں کہا گیا؟ حضرت معاویہؓ کو صحابی و فقیہ اور مجتہد ہونے کے باوجود خلفائے راشدین میں کیوں شمار نہیں کیا گیا؟ خلافتِ راشدہ اور اس ملوکیت کے نظام میں کیا فرق تھا جس کی بنا پر ایک کو خلافتِ راشدہ اور دوسرے کو ملوکیت کہا گیا؟ خلافت سے ملوکیت کی طرف یہ انتقال کیا حضرت معاویہؓ کے زمانے میں نہیں ہوا تھا؟ اگر ہوا تھا تو آخر کیسے ہوا تھا؟ اور اس معاملے میں اہلِ سنت کا ردِ عمل کیا تھا؟ کیا وہ خلافت و ملوکیت دونوں کو یکساں اسلام کا نظام

مطلوب سمجھتے تھے، یا ان کے نزدیک اصل مطلوب خلافت تھی اور ملوکیت کو انہوں نے امّت کی مصلحت کی خاطر ایک ناگزیر بُرائی کے طور پر قبول کیا تھا؟ یہ ہیں وہ اصل سوالات جن سے تعرض کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ موجودہ دور کے فعّال عناصر کے ذہنوں کی اُلجھن کو دُور کیا جائے، اور انہیں واضح طور پر اسلام کا تصورِ خلافت سمجھایا جاتے۔ اور وہ غلط فہمیاں رفع کی جائیں جن کی بنا پر وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ خلافت کا نظام اشخاص و افراد کی کسی غلطی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنی کسی نظریاتی داخلی کمزوری کی بنا پر نہیں چل سکا، اس لیے اس کے احیاء کا خیال ہی فضول ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ علمائے کرام میں سے کوئی صاحب بھی ان سوالات سے تعرض نہیں فرماتے اور جو صاحب بھی اُٹھتے ہیں خلافت و ملوکیت کی ایک ضمنی بحث پر لے دے شروع کر دیتے ہیں۔

مولانا عثمانی صاحب نے اِس بات کو بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ مناقبِ صحابہؓ یا مشاجراتِ صحابہؓ اِس کتاب کا اصل موضوعِ بحث نہیں ہے، بلکہ جن مسائل پر اس کتاب میں کلام کیا گیا ہے ان کے سلسلے میں یہ بحث ایک ناگزیر علمی ضرورت کے طور پر آئی ہے، اور جو شخص بھی اِن مسائل سے تعرض کرے گا اُسے لازماً اِس بحث سے سابقہ پیش آئے گا۔ عثمانی صاحب بڑے ناصحانہ انداز میں اس پر اِس طرح اعتراض فرماتے ہیں کہ گویا خلافت و ملوکیت کا مصنف پہلا شخص ہے جس سے مشاجراتِ صحابہ کو زبانِ قلم پر لانے کا قصور سرزد ہوا ہے حالانکہ پہلی صدی ہجری سے لے کر اِس دَور تک کسی نہ کسی علمی ضرورت کی بنا پر بکثرت محدثین، شارحینِ حدیث، فقہاء، متکلمین، اور تاریخ اسلام کے مصنفین، جو سب کے سب اکابر اہلِ سنّت میں شمار کیے جاتے ہیں، ان واقعات کو بیان کرتے رہے ہیں۔ اگر یہ فعل قابلِ اعتراض ہے تو پہلی مرتبہ یہ گناہ خلافت و ملوکیت کے مصنف ہی سے نہیں ہوتا ہے۔ پھر آخر اِس گناہ کے پچھلے مرتکبین کو مواخذہ سے کیوں بری کر دیا گیا؟ عثمانی صاحب چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں ابن خَلدُون کو حجت مان کر بس اُس رائے پر اکتفا کیا جائے جو انہوں نے اپنے مقدمہ میں بیان کی ہے۔ لیکن اوّل تو اِس خلدون نے خود اپنی تاریخ میں مشاجراتِ صحابہؓ کے واقعات بیان کرنے کا گناہ کیا ہے۔ معلوم نہیں عثمانی صاحب نے ان کی تاریخ بھی پڑھی ہے یا فقط مقدمہ ہی پڑھ کر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ دوسرے اسلام کے تنہا ایک ہی فقیہ و محقق ابن خلدون نہ تھے، دوسرے محققین بھی ہمارے سلف میں پائے جاتے ہیں جن کی رائے ابن خلدون سے مختلف ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خلافت و ملوکیت کے مسئلے میں ابن خلدون کی

پوری بحث کو شاید عثمانی صاحب نے پڑھا اور سمجھا نہیں ہے، ورنہ وہ اسے سند قرار دینے کی جرأت نہ کرتے اگر ضرورت پیش آئی تو میں تفصیل سے بتاؤں گا کہ ابن خلدون کے نظریے میں کیا قباحتیں ہیں اور اسے مان لینے سے اسلام کے نظامِ سیاست میں کیا گھپلا واقع ہوتا ہے۔

توریث مسلم من الکافر کا مسئلہ مدیر البلاغ نے اپنی تنقید کا ہدف خاص طور پر خلافت وملوکیت کے اُس حصے کو بنایا ہے جو حضرت امیر معاویہؓ سے متعلق ہے، کیونکہ ان کے خیال میں مولانا مودودی "حضرت معاویہؓ کے بارے میں انتہائی خطرناک حد تک پہنچ گئے ہیں جس سے اللہ لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے"۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ "امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے نہ مسلمان کافر کا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانہ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس بدعت کو ختم کیا"۔ مولانا محمد تقی صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ حضرت معاویہ پر بدعت کا الزام بالکل غلط ہے کیونکہ یہ بھی "دوسری سنت" تھی جو حضرت معاویہؓ نے جاری کی تھی، بدعت نہ تھی۔ آپ فقیہ ومجتہد تھے اور محض حضرت علیؓ سے "اختلاف" کی وجہ سے وہ شرعی مسائل میں حقِ اجتہاد سے محروم نہیں ہوسکتے۔ پھر اس مسئلے میں حضرت معاذ بن جبل اور متعدد تابعینؒ حضرت معاویہؓ کے ہم نوا ہیں۔ اور ان کے حق میں ایک حدیث مرفوع موجود ہے کہ الاسلام یزید ولا ینقص۔

جناب محمد تقی صاحب نے امیر معاویہؓ کے اس فعل یعنی توریث مسلم من الکافر کو جس طرح اجتہاد اور سنتِ ثانیہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ متعدد پہلوؤں سے محلِ نظر ہے۔ اس میں سوال کسی صحابی یا تابعی کی ذات کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک اصولی مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک طرف اگر قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ موجود ہوں، سنتِ نبویہ اور سنتِ خلفائے راشدین اربعہ موجود ہو، اور دوسری طرف کسی صحابی یا تابعی کا قول یا فعل ہو جو صریحاً ان سب سے متعارض ہو تو کیا اسے بھی دوسری سنت یا اجتہاد کا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ امر مسلّم ہے کہ قرآن مجید کی آیاتِ وراثت وولایت کے مخاطب یا مکلّف کفار نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ قانونِ وراثت کا بیان ہی یُوصِیکُمُ اللہ کے الفاظ سے شروع کیا گیا ہے جس کا خطاب صریحاً مسلمانوں سے ہے۔ اس طرح ان آیات کے نزول کے بعد کافر ومسلم کے مابین توریث کو منقطع کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک مناکحت کا تعلق ہے اس کے بارے میں قرآن مجید

ہیں صرف اہل کتاب کے معاملے میں اس حد تک استثنا کر دیا گیا ہے کہ محصناتِ اہلِ کتاب سے مسلمان مرد نکاح کر سکتا ہے اور کتابی مسلمان عورت سے نکاح نہیں کر سکتا لیکن قرآن مجید میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ کافر تو مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا مگر مسلمان کافر کا وارث ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کے بعد احادیثِ صحیحہ کو لیجیے۔ اگر کوئی حدیثِ صحیح اور سنّتِ ثابتہ ایسی موجود ہوتی جو احکامِ قرآنیہ میں تخصیص یا تشریح کے ذریعے سے مسلمان کو کافر کا وارث بنا دیتی تو بلاشبہ وہ لائقِ اتباع ہوتی لیکن صحاح ستہ میں نہایت صحیح، مرفوع، متصل احادیث میں ارشادِ نبوی وارد ہے کہ لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم (نہ مسلمان کافر کا وارث ہے اور نہ کافر مسلمان کا وارث)۔ لا یتوارث اھل الملتین (دو مختلف ملتوں یعنی ملتِ اسلام اور ملتِ کفر کے پیرو باہم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہیں)۔ ان صاف اور صریح احادیث کے مقابلے میں یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ الاسلام یعلو ولا یُعلیٰ (اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا)۔ اور الاسلام یزید ولا ینقص (اسلام بڑھتا ہے گھٹتا نہیں)۔ یہ دونوں حدیثیں سرے سے وراثت کے مسئلے سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتیں اور ان کے بالمقابل خاص وراثت ہی کے مسئلے میں نصوصِ کتاب و سنت قطعاً صریح الدلالت ہیں۔ اگر اسلام کے غلبہ و اضافہ کے عمومی اور اصولی بیان کو دلیل بنا کر مسلمان کو کافر کا وارث بنانا درست ہو سکتا ہے تو پھر ایک مشرکہ سے نکاح بھی درست ہو سکتا ہے اور ایک غیر مسلم کی جان و مال سے ہر طرح کا تعرض درست ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ان دو روایتوں کی سند میں بھی انقطاع ہے۔ محمد تقی صاحب نے ابنِ حجرؒ کے حوالے سے یہ تو لکھ دیا ہے کہ الاسلام یزید ولا ینقص حدیث مرفوع ہے جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے، لیکن انہوں نے ابوداؤد باب الفرائض کھول کر اس روایت کو نہ دیکھا۔ اس کے راوی ابوالاسود کہتے ہیں کہ: ان رجلاً حدثہ ان معاذاً قال سمعت ۔۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے یہ روایت ایک غیر معلوم الاسم اور مجہول الحال راوی نے نقل کی ہے، اس لیے حافظ ابن حجرؒ کی مراد مرفوع سے مرفوع منقطع ہے نہ کہ متصل۔ اس کے بعد حضرت معاذؓ بن جبل سے اس روایت اور اس پر مبنی مسلک کی نسبت بہت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خود امام ابوداؤد نے اس روایت سے پہلے

لا یرث المسلم الکافر . . . . اور لا یتوارث اھل ملتین شتی والی احادیث صحیح سند کے ساتھ درج کر دی ہیں۔ پھر ان قولی احادیث کے سوا کوئی ایک فعلی حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس میں یہ مذکور ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کافر کے مرنے پر کسی مسلمان کو اس کا وارث قرار دیا ہو یا کسی مسلمان کے اِس طرح وارث بن جانے کو جائز قرار دیا ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چاروں خلفائے راشدین کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ انہوں نے اِسی سنتِ ثابتہ کو جاری رکھا اور اس سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ ظاہر بات ہے کہ قانونِ وراثت کا تعلق بنیادی ملکی قوانین سے ہے اور عہدِ نبوی و عہدِ خلافتِ راشدہ میں سینکڑوں ایسے کفار کی موت واقع ہوئی ہوگی جن کے اعزا و اقربا مسلمان بھی ہونگے۔ مگر کیا کوئی ایک واقعہ بھی حدیث، سیرت یا تاریخ کی کسی ایک کتاب میں ایسا مل سکتا ہے کہ کسی مسلمان کو کسی کافر کا وارث قرار دیا گیا ہو؟ یا حضرت معاذ بن جبل یا امیر معاویہؓ یا کسی دوسرے صحابیؓ نے وراثت کے کسی مقدمہ میں آکر یہ شہادت دی ہو کہ آنحضورؐ کا ایسا بھی کوئی ارشاد موجود ہے جس کی بنا پر مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا کم از کم کسی مسلمان نے یہ دعویٰ ہی کیا ہو کہ اسلام چونکہ نقصان کے بجائے زیادتی کا باعث ہے اس لیے مجھے کافر مورث سے ورثہ دلایا جائے؟ خلفائے راشدین کا طریقہ تو یہ رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے خلافت سنبھالتے ہی یہ اعلان کیا کہ "انا متبع ولست بمبتدع" (میں کتاب و سنت کا متبع ہوں، مبتدع یعنی نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں)۔ ان حضرات کا عام قاعدہ یہ تھا کہ اہم امور میں اگر کوئی اختلاف و اشتباہ ہوتا تھا تو صحابۂ کرام کو جمع کیا جاتا تھا، اعلان کیا جاتا تھا کہ فلاں معاملے میں اگر کسی کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ہو تو اسے آکر پیش کیا جائے۔ ایسے عام اور وقیع مسئلے میں اگر آنحضورؐ کے ایک سے زائد اقوال ہوتے تو وہ ضرور سامنے آجاتے۔

اس سنتِ رسول اور سنتِ خلفائے راشدین کے بالمقابل امیر معاویہؓ کا ایک فیصلہ اور طریقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ "دوسری سنت" ہے، یا یہ ایک فقیہ یا ایک مجتہد کا قیاس و اجتہاد ہے۔ یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے آج کل ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور پرویز صاحب جیسے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہر امیر یا مرکزِ ملت جو کچھ طے کر دے وہی سنت ہے، اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ طے کیا تھا

صرف وہی سنّت نہیں ہے بلکہ بعد کے ادوار کا تعامل بھی سنت ہے۔ محمد تقی صاحب نے اس ضمن میں امام زُہری کے الفاظ السُّنۃ الاُولیٰ سے یہ عجیب نکتہ پیدا کیا ہے کہ یہ لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو طریقہ جاری کیا وہ السنۃ الاُخریٰ تھا۔ حالانکہ امام زُہری نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے آکر اس طریقے کو موقوف کیا اور پہلے طریقے کو جاری کر دیا۔ ان کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ پہلے طریقہ کو چھوڑ کر جو دوسرا طریقہ حضرت معاویہؓ نے جاری کیا وہ بھی سنت ہی تھا[1]۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد مبارک سے خلفائے راشدین کے دَور تک مسلسل جاری رہا ہو، اور اس کے بعد کوئی شخص اسے بدل کر دوسرا طریقہ جاری کر دے تو کیا اصطلاحِ شرع میں وہ بھی "سنت" ہی ہے؟ وہ اگر سنّت ہو تو پھر آخر بدعت کس چیز کا نام ہے؟ اس طرح کی سنّتیں تو پھر اور بھی ہیں جو امیر معاویہ، مروان، یا بنو مروان نے جاری کیں۔ مثلاً بیٹھ کر خطبہ دینا، خطبۂ عید کے لیے منبر لے جانا۔ اور نماز عیدین سے پہلے خطبہ پڑھنا[2]۔ کیا یہ سب اجتہادات ایک سنت ہی بنا رہے ہیں؟ اگر یہ ساری کارروائیاں "سنت"، یا مدیر البلاغ کے خیال کے مطابق "دوسری سنّت" کی تعریف میں آتی ہیں، تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ خلفائے بنو امیہ ہی کے ایک فرد حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ان کا خاتمہ ضروری سمجھا؟ اور اہلِ سنت کے کسی مسلک و مذہب نے آج تک ان کے مطابق عمل نہ کیا؟

علامہ بدرالدینؒ عینی اور حافظ ابن حجرؒ کے حوالے سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسروق، محمد بن حنفیہ، محمد بن علی بن حسین، سعید بن مسیّب، ابراہیم نخعی، اسحٰق بن راہویہ رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے کہ ہم کفار

---

[1] یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا مودودی نے البدایہ کے جو دو حوالے دیئے ہیں ان میں ایک جگہ السنۃ الاُولیٰ کے الفاظ ہیں اور دوسری جگہ جلد ۸ ص ۱۳۹ پر فقط السنۃ کا لفظ ہے، یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سنت کو قائم کر دیا۔

[2] شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں عن طاؤس قال خطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائماً وابوبکر وعثمان وان اول من جلس علی المنبر معاویۃ بن ابی سفیان (ازالۃ الخفاء جلد دوم ص ۲۹۹ ناشر نور محمد کراچی)۔
امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابابکر وعمر وعثمان کانوا یبتدؤن بالصلوٰۃ قبل الخطبۃ حتی قدم معاویۃ فقدم الخطبۃ (کتاب الام جلد اول صفحہ ۲۰۸ مطبع امیریہ مصر ۱۳۲۲ھ)، اسی طرح مروان کا نماز عید سے پہلے خطبہ پڑھنا صحاح ستہ کی متعدد احادیث میں مروی ہے اور بیٹھ کر خطبہ دینا بھی روایات میں مذکور ہے۔

کے یا اہلِ کتاب کے وارث ہوں کیونکہ یہ قیاس کا تقاضا ہے۔ لیکن امرِ واقعی اور صحیح بات یہ ہے کہ ان بزرگوں کی طرف اس قول کی نسبت کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے ثابت نہیں ہے۔ اور ثابت ہو بھی تو نصوصِ کتاب و سنّت کے مقابلے میں سرے سے کسی قیاس یا اجتہاد کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ مولانا محمد تقی صاحب نے ابن حجرؒ کی بحث سے اپنے مطلب کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور بقیہ کو حذف کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں:

وحجة الجمهور انه قياس فی معارضة النص وهو صريح فی المراد ولا قياس مع وجوده. اما الحديث فليس نص فی المراد بل هو محمول انه يفضل غيره من الاديان ولا تعلق له بالارث وقد عارضه قياس آخر وهو ان التوارث يتعلق بالولاية ولا ولاية بين المسلم والكافر لقوله تعالیٰ لا تتخذوا اليهود والنصاریٰ اولياء بعضهم اولياء بعض۔

اور جمہور کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان کو کافر کا وارث بنانا ایک ایسا قیاس ہے جو نص کے خلاف پڑتا ہے اور جب کسی مسئلے میں ایک نص موجود ہو جو اسی خاص مسئلے کے متعلق صریح حکم دے رہی ہو تو اس کی موجودگی میں قیاس کا کوئی موقع نہیں۔ رہی وہ حدیث جو اس قیاس کے حق میں پیش کی گئی ہے (یعنی الاسلام یزید ولا ینقص) تو اس کا وراثت کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا مطلب بس یہ ہے کہ اسلام دوسرے ادیان پر فضیلت رکھتا ہے اور یہ وراثت کے مسئلے میں کوئی نص نہیں ہے۔ پھر یہ قیاس ایک دوسرے قیاس سے بھی ٹکراتا ہے اور وہ اس طرح کہ توارث کا تعلق ولایت سے ہے اور مسلم اور کافر کے درمیان کوئی ولایت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مت بناؤ یہود و نصاریٰ کو اپنا ولی۔ وہ ایک دوسرے کے ولی (دوست اور خیر خواہ) ہیں۔

ابن حجرؒ کی عبارت کا ایک حصہ البلاغ میں نقل کر کے اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے سے بہتر نہیں دیکھا کہ ہم اہلِ کتاب کے وارث ہوں اور وہ نہ ہوں، جیسے ہمارے لیے ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے لیکن ان کے لیے ہماری عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔ یہ عبداللہ بن مغفل کا قول ہے جس کا رد آگے

خود ابن حجرؒ نے کر دیا ہے۔ مگر البلاغ میں اسے نقل نہیں کیا گیا۔ ابن حجر فرماتے ہیں:

فان الدلیل ینقلب فیما لو قال الذمی ارث المسلم لانہ یتزوج الینا۔	یہ دلیل تو اُلٹ کر ہمارے خلاف بھی پڑ سکتی ہے۔ ایک ذمّی یہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں بھی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہوں کیونکہ مسلمان ہماری عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے۔

اس مسئلے میں مولانا مودودی کے بعض ناقدین المُغنی لابن قُدامہ کے بھی نامکمل حوالے دیتے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کتاب کا وہ اقتباس بھی دے دیا جائے جو بحث کے آخر میں حاصلِ کلام کے طور پر درج ہے۔ المُغنی، ج ۶، ص ۲۹۶ پر ابن قُدامہ پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد بن الحنفیہ، علی بن حسین، سعید بن المسیب، مسروق، عبداللہ بن معقل، شعبی، ابراہیم نخعی، یحییٰ بن یعمر اور اسحاق کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مُسلم کو کافر کا وارث قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ولیس بموثوق بہ عنھم (اور اس کی نسبت اُن کی جانب قابلِ اعتماد نہیں ہے)۔ تقریباً یہی وہ نام ہیں جنہیں "البلاغ" میں بار بار دُہرایا گیا ہے۔ پھر ابن قدامہ فرماتے ہیں:

لا یرث الکافر المسلم ولا المسلم الکافر متفق علیہ۔ وروی ابوداؤد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یتوارث اھل الملتین شتی۔ ولان الولایۃ منقطعۃ بین المسلم والکافر فلم یرثہ کما لا یرث الکافر المسلم۔	"کافر مسلم کا وارث نہیں، نہ مُسلم کافر کا": یہ متفق علیہ حدیث ہے۔ اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "دو مختلف ملتوں کے پیرو ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے"۔ مزید یہ کہ مسلم اور کافر کے مابین ولایت کا تعلق منقطع ہے اس لیے جس طرح کافر مُسلم کا وارث نہیں ہو سکتا اسی طرح مسلم کافر کا وارث بھی نہیں ہو سکتا۔

<u>دِیَت کا مسئلہ</u> اس کے بعد ہم دیت کے مسئلے کو لیتے ہیں۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے "حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ دیت کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا۔ سنّت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی"۔ عثمانی صاحب اس پر فرماتے ہیں:

اوّل تو خط کشیدہ جملہ (یعنی اقتباس بالا کا پہلا جملہ) نہ حافظ ابن کثیر کا ہے، نہ امام زُہری کا، بلکہ یہ خود مولانا

کا ہے ۔ یہ نشاندہی ہم نے اس لیے کی ہے کہ مولانا کی عبارت سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حافظ ابن کثیر کا ہے ۔ البدایہ والنہایہ کی اصل عبارت یہ ہے : وبہ قال الزھری ومضت السنّۃ ان دیۃ المعاھد کدیۃ المسلم وکان معاویۃ اوّل من قصرھا الی النصف واخذ النصف لنفسہ

مذکورہ اسناد ہی سے امام زہریؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ : سنت یہ چلی آ رہی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہو گی اور حضرت معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اسے کم کر کے نصف کر دیا اور نصف اپنے واسطے لے لی ۔"

مدیر" البلاغ " نے ابن کثیر کے قول کے ساتھ سابق فقرے کے آخری الفاظ وبہ قال الزھری کو غلط طریق پر ملا کر ابن کثیر کے قول کو امام زہریؒ کا قول بنا دیا ہے ۔ حالانکہ قال اور بہ قال یا قال بہ کے معانی کا فرق تو انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا اور اس بات سے بھی بے خبر نہیں ہونا چاہیے تھا کہ بہ قال کے الفاظ کو بالعموم آخر میں لایا جاتا ہے اور اس کا اشارہ قول ماسبق کی جانب ہوتا ہے ۔ بہرکیف نفس مسئلہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ قائل خواہ ابن کثیر ہوں یا امام زہری ، قول یہی بیان ہوا ہے کہ پہلے سے یہ سنت چلی آ رہی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہو ، لیکن امیر معاویہؓ نے اسے نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی ۔

توریث مسلم من الکافر والے معاملے کی طرح یہاں بھی مدیر موصوف یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کا یہ فعل سنت میں تبدیلی نہیں ، بلکہ سنت ہی کی ایک صورت ہے ۔ انہوں نے اپنے حق میں استدلال کرتے ہوئے پہلی بات جو کہی ہے وہ یہ ہے کہ اخذ النصف لنفسہ کے بالمقابل سُنن بیہقی میں امام زُہری کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ القیٰ النصف فی بیت المال ۔ اس لیے لنفسہ سے مراد بھی بیت المال کے لیے دیت لینا ہے ، نہ کہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے ۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا سادہ اور اس کی توجیہ اتنی آسان نہیں جیسا کہ عثمانی صاحب یا بعض دوسرے حضرات نے سمجھا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ مؤرخین نے دوسرے مقامات پر بھی امیر معاویہؓ اور دوسرے بنو امیہ کے عائد کردہ غنائم و محاصل کے لیے دونوں طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ ایک ہی واقعہ میں کہیں لنفسہ کا لفظ ہے اور کہیں لبیت المال کا لفظ ۔ اب اگر بیت المال کی

پوزیشن فی الواقع امیر معاویہ اور آپ کے جانشینوں کے زمانے میں وہی ہوتی جو عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں تھی، تب تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہر جگہ لنفسہ سے مراد لبیت مال المسلمین ہے۔ لیکن بیت المال اگر ذاتی اور سیاسی مقاصد و اغراض کے لیے بلا تامل اور بے دریغ استعمال ہونے لگے، فرمانروا کے صرفِ خاص اور قوم کے بیت المال میں عملاً کوئی فرق نہ رہے، اور مسلمانوں کا امیر بیت المال کے آمد و خرچ اور حساب کتاب کے معاملے میں مسلمانوں کے سامنے جواب دہ نہ رہے، تو پھر صورتِ حال اُلٹ جاتی ہے۔ اس صورت میں اخذ لبیت المال بھی اخذ لنفسہ بن کر رہ جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تو بہت بالا و برتر ہے کہ آپ لا اسئلکم علیہ اجرا اور لا نُوْرَثُ ولا نُوَرِّثُ کے منصب پر فائز تھے۔ لیکن آپ کے خلفائے راشدین کے بارے میں بھی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ماسوا، جنہوں نے بیت المال سے کوئی معاوضہ ہی نہیں لیا، دوسرے خلفاء کے معمولی مشاہرے مقرر تھے جن پر وہ عسرت زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے ذاتی مصارف پر بیت المال کا ایک حبہ بھی خرچ نہ کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے پاس وفات کے وقت صرف سات سو درہم تھے۔ اور شیخینؓ نے تو اپنی تنخواہ بھی بیت المال میں لوٹا دینے کی وصیت فرمائی تھی۔ پھر ان کے زمانے میں ہر مسلمان کو بیت المال کے آمد و صرف پر محاسبہ کرنے کا حق تھا۔ امیر معاویہؓ کے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں، وہ ان سے بالکل مختلف ہیں۔ کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ بننے سے پہلے ہی حضرت علیؓ کے بالمقابل وہ شامی بیت المال پر علی الاطلاق قابض و متصرف تھے؟ حالانکہ اُس کی حیثیت مرکزی بیت المال کی ایک شاخ کی تھی۔ پھر کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ ان کے عہدِ خلافت میں خلیفہ کے لیے ایک مشاہرہ متعین کر دیا گیا ہو اور بیت المال کے مصارف ان کے ذاتی مصارف سے بالکل الگ رکھے گئے ہوں؟ اور کیا ان کے زمانے میں بھی کوئی مسلمان بیت المال کا حساب ان سے مانگ سکتا تھا؟ اس کے بعد جو حضرات لبیت المال کے الفاظ کو لنفسہ کے الفاظ سے مختلف معنی پر محمول کرتے ہیں ان کے استدلال میں کوئی زور باقی نہیں رہتا۔

مدیرہ "البلاغ" کے استدلال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ معاہد کی دیت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف روایتیں مروی ہیں، اس لیے یہ مسئلہ عہد صحابہ سے مختلف فیہ چلا آ رہا ہے کہ معاہد کی دیت

مسلم کی دیت کے برابر ہو یا کم ہو۔ امیر معاویہؓ نے اپنے فقہی اجتہاد کی بنا پر متعارض احادیث و آثار میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ آدھی دیت آپ نے ذمّی کے وارثوں کو دلوائی اور آدھی بیت المال میں داخل کر دی۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، امیر معاویہ کا یہ اجتہاد فی نفسہٖ نصوصِ کتاب و سنت کے خلاف ہے اور اس سے احادیثِ مختلفہ میں توفیق و تطبیق کی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے قرآن مجید سے رجوع کیا جائے تو وہاں سورۂ نساء، آیت ۹۲ میں مومن اور کافرِ معاہد، دونوں کے قتلِ خطا کے معاملہ میں دِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ کے الفاظ وارد ہوتے ہیں۔ قرآنی الفاظ کی مماثلت اور مساواتِ دیت کی روایات (مثلاً دیۃ ذمی دیۃ مسلم، تتکافا دماؤھم وغیرہ) صحابہ و تابعین اور فقہاء مجتہدین کے اسی مسلک کی تائید کرتی ہیں کہ دونوں دیتیں برابر ہیں، اور امام سرخسیؒ کے قول کے مطابق اس کے خلاف آثار پایہ صحت کو نہیں پہنچتے[ا] تاہم اس امر سے انکار نہیں کہ اس مسلک کے خلاف بھی روایات و آثار موجود ہیں۔ اس لیے بعض مذاہبِ فقہیہ نے کافرِ معاہد کی دیت کو مسلم کی دیت کا نصف یا ایک تہائی قرار دیا ہے اور ان مذاہب میں اسی کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن

قرآن مجید میں مسلم اور معاہد دونوں کی دیت کے متعلق مُسَلَّمَةٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کی دیت ہو یا کافرِ معاہد کی، بہر حال وہ پوری کی پوری مقتول کے اہلِ خاندان کے حوالے کر دی جائے۔ قرآن کا ارشاد اس معاملے میں بالکل ناطق اور صریح ہے جس میں اس تاویل کی قطعاً گنجائش نہیں کہ دیتِ مقررہ کا کوئی حصہ مقتول کے وارثوں کے بجائے کسی دوسرے کے پاس جائے۔ مُسَلَّمَةٌ اِلٰٓی اَھْلِہٖ کے الفاظ میں الیٰ امیر المومنین یا الیٰ بیت المال کا مفہوم آخر کس طرح داخل ہو سکتا ہے؟ اور اگر کسی تاویل یا کسی مصلحت کی رُو سے معاہد کی دیت کا کوئی حصہ مسلمانوں کے بیت المال میں جا سکتا ہے، تو پھر مسلمان کی دیت کا کوئی حصہ کیوں نہیں جا سکتا؟

روایات و آثار میں دیتوں کے تناسب و مقادیر میں تو اختلاف ضرور رہا ہے لیکن کوئی ''گری پڑی'' روایت

[ا] وما نقلوا فیہ من الآثار بخلاف ھذا لا یکاد یصح۔ فقد روی عن معمر رضی اللہ عنہ قال سألتُ الزھری عن دیۃ الذمی، فقال مثل دیۃ المسلم۔ فقلت ان سعیداً یروی بخلاف ذلک۔ قال ارجع الیٰ قولہ تعالیٰ وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق فدیۃ مسلمۃ الیٰ اھلہ۔ (المبسوط جلد ۲۶ ص ۸۵)

بھی مجھے نہیں مل سکی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ ذمّی یا معاہد کی دیت، خواہ وہ دیتِ مُسلم کے مساوی ہو یا ۱/۲ یا ۱/۳، اس کا کوئی حصہ بیت المال میں بھی جا سکتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں اور ان کے بیت المال کا خیر خواہ اللہ اور اس کے رسُول سے زیادہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ مسلم و غیر مسلم کے جو حقوق و واجبات جس شکل میں کتاب و سنت نے متعین کر دیئے ہیں، ان میں نہ کمی جائز ہے نہ زیادتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ جو ذمیوں کے حقوق پر دست درازی کرے میں اس کے خلاف قیامت کے روز خود مدعی ہونگا (انا خصمہم یوم القیامۃ)۔ یہی وجہ ہے کہ روایات کے اختلاف کی بنا پر بعض فقہی مذاہب میں مُعاہد کی دیت مسلمان کے مقابلے میں کم تو بیان کی گئی ہے لیکن سب کا منشا یہی ہے کہ جو دیت بھی ہو وہ پُوری کی پُوری مقتول کے وارثوں کے حوالے کی جائے، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: نہ یہ کہ مسلمان کی دیت تو اس کے اہلِ خاندان کو پُوری دی جائے اور کافر معاہد کی دیت کا آدھا یا دو تہائی بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ نے درحقیقت نہ اِس مسلک پر عمل کیا کہ ذمّی کی دیت مسلمان کے برابر ہے، اور نہ اِس پر کہ اُس کی دیت مسلمان سے آدھی ہے۔ بلکہ انہوں نے کیا یہ کہ اُس کی دیت تو رکھی مسلمان کے برابر ہی، مگر آدھی اس کے وارثوں کو دی اور آدھی خزانے میں داخل کر دی۔ یہی فعل بدعت تھا کیونکہ اس کے لیے کوئی برائے نام دلیل بھی قرآن و سنت میں نہیں ہے۔ امام زُہری کی دوسری روایت جو "البلاغ" نے ابن کثیر والی روایت کے مقابلے میں سُنن بیہقی سے نقل کی ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دیت کا وہ حصّہ جو امیر معاویہؓ نے بیت المال کے لیے مقرر کیا تھا، ساقط کر دیا۔

میرا خیال یہ ہے کہ توریث مسلم من الکافر کے معاملے میں تو خیر ایک صحابی اور چند تابعین کی جانب امیر معاویہ کی ہمنوائی منسوب کی گئی ہے، گو وہ غیر موثق ہی سہی، لیکن اِس دوسرے اجتہاد میں تو غالباً امیر معاویہؓ بالکل ہی تنہا ہیں کہ ذمّی کی دیت مقرر ہو جانے کے بعد، اس کا کوئی حصہ بیت المال میں داخل کیا جائے۔ مجھے باوجود کوشش و تلاش کے کوئی روایت، اثر یا فقہی جزئیہ ایسا نہیں مل سکا جس سے یہ ثابت ہو کہ معاہدِ مقتول کی دیت کی کوئی مقدار ایسی بھی ہے جو بیت المال میں داخل کی جانی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر خلفائے راشدین کے پورے دور تک اس امر کی کوئی مثال بھی نہ پائی گئی کہ کبھی کسی معاہد

کہ دیت کا کوئی حصہ بیت المال میں داخل کیا گیا ہو۔ دیتوں کا اختلاف و عدمِ مساوات اور چیز ہے اور ان میں سے کسی جزو کا بیت المال میں جانا اور چیز۔ اس دوسری چیز کا ثبوت اگر امیر معاویہؓ کے سوا کسی اور سے ملتا ہو تو اسے پیش کیا جانا چاہیے۔

عثمانی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے عمل کی مصلحت ان کی اپنی زبانی یہ پیش کی ہے کہ اگر ذمّی کے قتل سے اس کے رشتہ داروں کو نقصان پہنچا ہے تو مسلمانوں کے بیت المال کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ اس کی مزید تشریح عثمانی صاحب نے یہ کی ہے کہ جو جزیہ وہ ادا کرتا تھا وہ بند ہو گیا، اس لیے دیت کا آدھا حصّہ (پانچ سو دینار) مقتول کے رشتہ داروں کو دو اور آدھا ہی بیت المال میں لو۔ اس انوکھے استدلال سے اگر کوئی شخص مطمئن ہو جائے تو میں اسے مدیر البلاغ کی کرامت ہی شمار کروں گا۔ سوال یہ ہے کہ ذمّی کے قتل سے اگر بیت المال کا نقصان ہوتا ہے تو مسلمان کے قتل سے بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ بھی تو زکوٰۃ، عُشر، صدقات دیتا ہے۔ تو پھر مسلمان کی دیت کا ایک حصّہ بھی کیوں نہ اس کے وارثوں کے بجائے بیت المال کو جائے؟ بلکہ قتل کیا معنی، جو ذمّی یا مسلمان طبعی موت مرتا ہے یا کسی حادثے کا شکار ہوتا ہے، اس سے بھی تو بیت المال کا نقصان ہوتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہر مرنے والے کے ترکے پر، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، موت کا ایک محصول (DEATH DUTY) عائد کر دیا جائے۔ جو وراثت کی تقسیم سے پہلے بیت المال کے لیے وصول کر لیا جائے؟ مغربی ممالک میں تو اس کا عام چلن ہے۔

حیرت ہے کہ مدیر البلاغ پھر بھی فرماتے ہیں کہ ایسے حسین استدلال و اجتہاد کی تعریف نہ کرنا کتنا بڑا ظلم ہے۔ کیا میں ان سے دریافت کر سکتا ہوں کہ اگر اجتہاد و فقاہت میں حضرت معاویہؓ کا یہی مقام تھا، اور وہ خود ایک نئی "سنّت" جاری کرنے تک کے مجاز تھے، اور سنتِ نبویہ اور سنتِ خلفائے راشدین سے ہٹ کر ایک کام کر کے بھی وہ قابلِ تحسین ہی تھے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ علمائے اہلِ سنّت نے انہیں پانچواں خلیفۂ راشد تسلیم نہیں کیا؟ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ علمائے اہلِ سنت آج تک کسی تعصب میں مبتلا رہے ہیں۔ اس ظلم کی تلافی اب آپ حضرات فرمائیں اور کھل کر ان کی خلافتِ راشدہ کا اعلان کر دیں۔　　(باقی)